ملک محمد توقیر احمد
پی۔ایچ۔ڈی سکالر، شعبہء اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ
استاد، شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیوسٹی، اسلام آباد

قاضی عبدالودود کے تصوراتِ تحقیق

Malik Muhammad Touqeer Ahmed
Scholar PhD Urdu, Allama Iqbal Open University, Islamabad.
Dr. Arshad Mahmood Nashad
Associate Professor, Urdu Department, Allama Iqbal Open University, Islamabad.

Qazi Abdul Wadud's Research Concepts

Qazi Abdul Wadood (1896-1984) was a prominent Urdu researcher of 20th century. His distinguished trait is to introduce the western pattern of research in. He endowed himself for literary research and remained undaunted, unbaised and rational in his research papers. He spent his Urdu whole life in the furtherance of problem based research. His work exceeds 400 research articles. In his papers he emphasized on exactness and also rectified pieces of literary information in his distinct equitable scientific style. "Meer" "Taayyan e zaman" "zaban shanasi" "Awara gard ashaar" "Shora k tazkary" and "jahan e Ghalib" was his pivitol series of research papers. In this paper PecificConcepts of Qazi Abdul Wadood on research is discussed.

Key Words: *Prominent, Urdu Researcher, Introduce, Western Pattern, Literary, Undaunted, Unbaised, Rational.*

قاضی عبدالودود ریاست بہار کے دارالحکومت پٹنہ کے متمول خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد قاضی عبدالوحید، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے شاگرد اور مرید تھے۔ اُنھوں نے پٹنہ میں "مدرسہ حنفیہ" قائم کیا۔ قاضی عبدالودود نے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم اسی مدرسے میں پائی۔ والد کی خواہش پر پندرہ برس کی عمر میں مکمل قرآن کریم حفظ کیا لیکن اُن کی وفات کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہو گئے۔ محمڈن سکول پٹنہ اور علی گڑھ یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ جنگِ عظیم اوّل کی کشیدگی کے دوران علی گڑھ سے پٹنہ واپس آ کر اُنھوں نے ۱۹۱۶ء میں پرائیویٹ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پٹنہ کالج سے ایف اور بی اے کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں

قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیمبرج یونی ورسٹی لندن چلے گئے۔ ۱۹۲۹ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وطن واپس آئے، لیکن وکالت کے بجائے ادبی تحقیق کو ہمہ وقتی مشغلہ بنالیا۔

قاضی عبدالودود کے فطری رجحانات نے علی گڑھ میں نشو و نما پائی۔ علی گڑھ کالج میں سرسید کے نظریات گردش کر رہے تھے۔ فلسفیانہ فکر، منطقی استدلال، مذہب اور عملی زندگی میں سائنسی نقطہ نظر اور جدید سائنسی علوم و فنون کی طرف رغبت وغیرہ سرسید کے نمایاں میلانات تھے۔ وہ تقلید اور قدامت پرستی کے مخالف تھے اور جدیدیت کے زیر اثر اُن کے ہاں تشکیک کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں سرسید کے ان تصورات سے شخصی زندگی متاثر ہوئی۔ یہاں دو پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل مختلف علوم و فنون کو عالمی تناظر میں نئے نقطہ نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں علوم و فنون کی منجمد روایت میں حرکت و حرارت پیدا ہوئی۔ دوم تشکیک کی بدولت مذہبی سطح پر الحادی نظریات فروغ پانے لگے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی سے فارغ ہونے والے طلبہ اِن تصورات سے براہِ راست متاثر ہوئے۔ قاضی عبدالودود کی شخصیت دونوں حوالوں سے متاثر ہوئی۔ عملی طور پر انھوں نے تحقیق اور تنقید کو زندگی کا نصب العین بنایا اور تشکیک کی بنا پر تحقیق، تدوین اور تنقید میں نئی نئی راہیں پیدا کیں اور اسی کی بدولت مذہب کے معاملے میں الحادی نظریات کا اظہار بھی کرنے لگے۔

قاضی صاحب سائنسی فکر کے حامل تھے۔ انسانوں، چیزوں، مسائل اور ادبی معلومات کو اِسی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ ادبی تحقیق اور تنقید میں اُن کی فکر معروضی جائزے کی طرف مائل تھی۔ اُنھوں نے ادبی حقائق کو سائنسی نقطہ نظر سے جانچنے اور معروضی انداز میں بیان کرنے کی بناڈالی۔ وہ تحقیق میں جذباتی اور تاثراتی رائے سے گریز پا رہے۔ اُن کی اصول پسندی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اس معاملے میں وہ جذباتی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ مزاجاً غیر مقلد تھے، اسی وجہ سے اُن کی شخصیت غیر مرعوب تھی۔ فکری آزادی کی بدولت تنقید میں اُنھوں نے واضح، دوٹوک، بے لاگ اور سخت رویہ رکھا۔

قاضی عبدالودود صفِ اوّل کے محقق تھے۔ تحقیق کا ذوق اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ فطری ذوق کی بنا پر اُنھوں نے اپنی زندگی صرف ادبی تحقیق اور تنقید کے لیے وقف کی۔ اُنھوں نے چار سو سے زائد تحقیقی مقالات لکھے۔ اُن کے مقالات اعلیٰ تحقیقی معیار اور معروضی طرزِ بیان کے حامل ہیں۔ اُنھوں نے تنقید سے اردو تحقیق کو جدید مغربی طرزِ تحقیق سے متعارف کرایا اور اردو ادب پر عملی تحقیق سے اس کے نمونے بھی فراہم کیے۔ عملی تحقیق میں ''تعین زمانہ'' ''زبان شناسی'' ''آوارہ گرد اشعار'' ''شعرا کے تذکرے'' ''جہانِ غالب'' اور ''چند اہم اخبارات و رسائل''

وغیرہ قاضی صاحب کے معرکہ آرا تحقیقی سلسلے تھے جو کتابی شکل میں بھی اِنھی عنوانات سے شائع ہوئے۔ اِن کے علاوہ اُن کے تنقیدی تبصرے توسیعی تحقیق کا بہترین نمونہ ہیں۔ قاضی صاحب کی عملی تحقیق بنیادی اور مخصوص مسائل کا حل پیش کرتی ہے۔

''تعین زمانہ'' تاریخی تحقیق کا سلسلہ تھا۔ اس کے تحت اُنھوں نے اردو میں پہلی مرتبہ بنیادی معلومات پر توجہ مرکوز کرکے دو سو مصنفین اور شعرا کی پیدایش، وفات، وطن، سفر، حضر اور تصانیف کے انطباع وغیرہ کی قدیم مآخذ کی روشنی میں تعیین کی۔ اُنھوں نے اپنے جاری کردہ ''معیار''[۱۹۳۶] میں ''سالِ وفات آبروؔ'' ''سالِ وفات حاتمؔ'' اور ''میر تقی میرؔ کے لکھنو جانے کی روایت'' وغیرہ کے عنوان سے مختصر مقالات لکھے۔ ان مقالات میں اُنھوں نہایت اختصار کے ساتھ جملہ دستیاب مآخذ سے روایات کا تجزیہ کرکے نتائج اخذ کیے۔ ان بنیادی معلومات کی تحقیق سے قاضی صاحب نے تذکروں اور ادبی تواریخ میں راہ پانے والی بے بنیاد معلومات کی تصحیح کی۔

''زبان شناسی'' اُن کی لسانی تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس مجموعے میں نو تحقیقی مقالات ہیں: زبان شناسی؛ لسانیات؛ فرہنگِ آصفیہ پر تبصرہ؛ چند الفاظ و طرقِ استعمال؛ بعض کتب فارسی کے مستعملہ مفردات و مرکبات؛ حافظ اور ذال فارسی؛ فرہنگِ ابو حفص؛ مجمع الفرس؛ چند الفاظ و طرقِ استعمال [استعمالِ غالبؔ] (مسودہ)۔ پہلا مقالہ زبان شناسی کے عنوان سے ہے۔ اس طویل مقالے میں دیوانِ قائم؛ کلیاتِ جعفر علی خاں حسرتؔ اور کلیاتِ جرأت حصہ اول و دوم کی تحقیق سے اِن شعرا کے ہاں قریباً ایک ہزار اردو الفاظ و مرکبات کے مخصوص استعمالات (املا، تلفظ، معانی، تذکیر و تانیث، واحد جمع، روزمرہ و محاورات اور قوافی وغیرہ) کو امثال و اسناد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ لسانیات کے عنوان سے مقالے میں ارگجہ، خضری خبر اور تنقید کے الفاظ کی لغات اور دیگر مآخذ سے تحقیق پیش کی گئی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ پر تبصرہ میں قاضی صاحب نے مؤلف کے طریقِ کار کو غیر یک ساں قرار دیا اور سترہ تحقیقی غلطیوں کی نشان دہی کرکے اصلاح بھی کی۔ علاوہ ازیں یہ دکھانے کے لیے کہ اس فرہنگ میں بہت سے اہم الفاظ موجود نہیں ہیں، کلیاتِ سوداؔ؛ کلیاتِ میرؔ؛ دیوانِ قائمؔ؛ کلیاتِ قائمؔ؛ غزلیاتِ میرؔ؛ تذکرہ میر حسنؔ؛ دیوانِ مصحفیؔ اول و دوم؛ کلیاتِ جعفر علی حسرتؔ؛ مجموعہ نغز؛ کربل کتھا؛ دیوانِ ناجیؔ اور نفس اللغۃ سے ۱۱۴۸ الفاظ بہ طور مثال مع اسناد پیش کیے۔ اسی طرح فارسی کے نامور شعرا کے دواوین و کلیات سے سترہ سو پانچ ۱۷۰۵ اور غالب کے ہاں ۶۲ الفاظ و مرکبات کے مخصوص استعمالات کو پیش کیا گیا۔ یوں مجموعی طور پر قاضی صاحب نے تقریباً ساڑھے تین ہزار سے

زیادہ اردو فارسی الفاظ کے مخصوص استعمالات کی تحقیقات پیش کیں۔ اس گراں ارز سرمایۂ زباں کو ڈاکٹر گیان چند جین نے لفظ شماری سے تعبیر کیا ہے۔

''آوارہ گرد اشعار'' کے عنوان سے اُن کے دس مقالات معاصر (پٹنہ)، شاعر (بمبئی)، خاور (ڈھاکہ) اور نقوش (لاہور) وغیرہ میں شائع ہوئے۔ ان مقالات میں انھوں نے سو سے زائد تاریخی مآخذ کے استفادے سے قدیم تذکروں، دواوین و کلیات، فرہنگِ آصفیہ و نور اللغات اور دیگر متفرق اہم کتب میں تین سو الحاقی اشعار کی نشان دہی کر کے اصلاح کی۔

قاضی صاحب نے میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، غالبؔ، شادؔ اور شاہ کمال علی کمالؔ وغیرہ کے حالات و واقعات کو خصوصی طور پر تحقیق کا موضوع بنایا۔ اِن شعرا سے متعلق تحقیقی مقالات کو ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مجموعوں کی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ''شعرا کے تذکرے'' کے عنوان سے اُنھوں نے ساڑھے آٹھ سو شعرا کے تراجم کو تحقیق سے جمع کیا۔ غالبؔ قاضی صاحب کا پسندیدہ شاعر تھا۔ اُنھوں نے بارہ سو صفحات پر مشتمل غالب انسائیکلو پیڈیا کا منصوبہ تیار کیا۔ اس میں غالبؔ سے تعلق رکھنے والی ہر چیز: مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریریں، کتب، اشخاص، مقامات، تلمیحات یہاں تک کہ غالبؔ پر بننے والی فلموں کو بھی شامل کیا گیا۔ یہ منصوبہ قسط وار ''جہانِ غالب'' کے عنوان سے جاری رہا لیکن مکمل نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے تمام اقساط کو اسی عنوان سے جمع کر کے دو حصوں میں شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ ۲۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غالبؔ کے حوالے سے ۱۵۶، شخصیات؛ ۸۲، کتب؛ ۷، اشیاء؛ اور پانچ الفاظ پر تحقیق پیش کی جا سکی۔ اس سلسلے کو ڈاکٹر حنیف نقوی نے آگے بڑھایا۔

قاضی صاحب نے اردو میں پہلی مرتبہ قدیم اخبارات کو تحقیق کا موضوع بنا کر اہم خبروں کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اُن کا ایک بہت بڑا کارنامہ صفِ اوّل کے محققین و ناقدین کی تحقیقات کی تصحیح اور اُن پر اضافے ہیں۔ ان تبصروں سے محققین میں متن کی صحت کا خیال اور تحقیقی بیانات میں احتیاط سے کام لینے کا رجحان پیدا ہوا۔ حافظ محمود شیرانی کے بعد قاضی عبدالودود نے اردو تحقیق کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اردو کے تمام بڑے محققین نے اُن کی تحقیقی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے انھیں اُردو تحقیق کرنے والوں کا'' رہنما'' اور رشید حسن خاں نے اُنھیں اردو تحقیق کا'' معلمِ ثانی'' قرار دیا۔

تحقیق میں قاضی صاحب کا اصل کارنامہ اُن کی عملی تحقیق ہے۔ عملی تحقیق کا باضابطہ آغاز اُنھوں نے اپنے جاری کردہ ماہنامہ ''معیار'' بانکی پور [۱۹۳۶ء] سے کیا تھا۔ اُن کے مقالات ہندوستان اور پاکستان کے مؤقر

رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ اُن کے بیشتر مقالات ''معاصر'' پٹنہ میں شائع ہوئے۔ تحقیق کے نظری مباحث پر اُنھوں نے کوئی مربوط کام نہیں کیا تاہم نظری مباحث سے متعلق درج ذیل چار مقالات اہمیت کے حامل ہیں۔ قاضی صاحب نے فن تحقیق کے بارے میں زبانی خیالات کا اظہار ۱۰ جنوری ۱۹۵۸ء میں ایک ادبی نشست میں کیا۔ یہ تصورات مرتب کے قلم سے '' ادب اور تحقیق'' کے عنوان سے فکر و نظر (کراچی) ستمبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئے۔ رسالہ آج کل کے اگست ۱۹۶۷ء میں ''اصولِ تحقیق '' کے عنوان سے اُن کا ایک مضمون شائع ہوا۔ خدا بخش لائبریری سیمینار میں اُنھوں نے ''صحت متن'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا جو ماہنامہ تحریک (دہلی) ستمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ لکھنؤ یونی ورسٹی کی شعبہ اردو کی جانب سے تحقیق کے فن پر شائع ہونے والی پہلی کتاب ''رہبر تحقیق'' [۱۹۶۹ء] پر انھوں نے تبصرہ لکھا جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے پہلے شمارے [۱۹۷۷ء] میں شائع ہوا۔ یہ چاروں مضامین اُن کے مجموعہ مقالات ''اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں'' میں شامل ہیں۔ اِن مضامین سے ادب اور تحقیق کے بارے میں قاضی صاحب کے تصورات واضح طور پر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اُن کے تحقیقی مقالات اور تنقیدی تبصروں میں بھی اُن کا تصورِ تحقیق جھلکتا ہے۔ مذکورہ مقالات کی روشنی میں تحقیق سے متعلق اُن کے مخصوص تصورات پیش خدمت ہیں۔

تحقیق : تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے، کوشش کا لفظ ارادتاً مستعمل ہوا ہے، وجہ یہ کہ دیکھنا اور دیکھنے کی کوشش ایک نہیں۔ کوشش کامیاب بھی ہوتی ہے اور ناکام بھی، کامیابی کبھی جزوی ہوتی ہے، کبھی کلی۔ ایک امریکی مصنف نے مسٹر بیل کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ خارجی حقیقت (اوبجیکٹو ریلٹی) کا وجود نہیں، مجھے اس سے انکار ہے۔ حقیقت موجود ہے، یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے پاس اس کے دریافت کرنے کے نامکمل ذرائع ہوں۔''(۱)

تحقیق کی متعین کردہ تعریف کا ہر جملہ قابلِ غور ہے۔ ادبی تحقیق کا مواد تحریر ہے۔ تحریر کو دیکھنا اور اُس کو اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش کرنا دو مختلف زاویہ ہائے نگاہ ہیں۔ اول الذکر عمومی مطالعے جب کہ مؤخر الذکر میں مطالعے کے وسیلے سے حقیقتِ حال (روحِ متن) تک پہنچنے کی فکر کارفرما ہے۔ تحریر جو پیغام پہنچاتی ہے، وہ پیغام

صرف درست یا غلط ہی نہیں ہوتا؛ بل کہ منحرف، مبدل، جزوی صداقت، یا نیم جزوی صداقت کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔ محقق کا اولیں فرض ہے کہ وہ ہر تحریر کو شک کی نگاہ سے دیکھے اور حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے۔ قاضی صاحب کی تحقیق کا بنیادی اصول یہی ہے۔ اسی اصول کی مدد سے انھوں نے اردو ادب کی تاریخ سے بہت سی غیر حقیقی باتوں اور جزوی صداقتوں کی نشان دہی کی۔

معاشرہ اور تحقیق:

ادبی تحقیق کو عام طور پر معاشرے سے الگ کر کے دیکھا جاتا ہے۔ حالاں کہ اس کا معاشرے سے گہرا تعلق ہے۔ معاشرتی اخلاقیات کا تحقیق پر براہِ راست اثر ہوتا ہے۔ قاضی صاحب اس تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کسی شخص کا قول ہے کہ ہر قوم کو اسی طور کی حکومت ملتی ہے جسکی مستحق ہے۔ یہی بات تحقیق کے متعلق بھی کہی جاتی ہے، کسی ملک کے باشندوں کا معیارِ اخلاق پست ہو، اور وہ کام سے جی چراتے ہوں تو وہاں بالعموم تحقیق کا درجہ پست ہو گا۔ اُردو ادب کی تاریخیں خواہ وہ جامع ہوں، خواہ کسی خاص دور، علاقے یا صنف سے تعلق رکھتی ہوں، سخت بے احتیاطی سے لکھی گئی ہیں۔''(۲)

قاضی صاحب تحقیق کو مجموعی معاشرتی اخلاقیات کا عکس قرار دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک فرانس میں تحقیق کا معیار اس لیے بلند تھا چوں کہ وہاں معیار زندگی بلند تھا اور معاشرتی اخلاقیات دیگر ممالک کی نسبت ترقی یافتہ تھی۔ مجموعی انسانی رویے اُن کے کام کرنے کے انداز کا تعین کرتے ہیں۔ زود یقینی، جذباتی طرزِ عمل، عدم احتیاط، فریب، جھوٹ اور مفاد پرستی وغیرہ کا تعلق معاشرت سے ہے لیکن ان کا تحقیق پر براہِ راست اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح منطقی طرزِ فکر، تشکیک، غیر جذباتی رویہ، احتیاط، دیانت داری، سچ اور حق پرستی جیسے اوصاف جس معاشرے میں پائے جاتے ہیں، وہاں یہی اوصاف تحقیق میں بھی نظر آتے ہیں۔

ذاتی دلچسپی اور پسند بھی تحقیق پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن ترقی یافتہ معاشرے میں جہاں ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دی جاتی ہے وہاں اس کے اثرات کم سے کم ہوتے ہیں۔ تحقیق کی روح حقیقت بیانی ہے، اور مصلحت اندیشی سے حقائق کا چہرہ سامنے نہیں آتا۔ محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ ذاتی مفاد، مصلحت اور تعصب سے دور رہ کر

حقائق کا معروضی تجزیہ کر کے حقیقت کو بیان کرے۔ تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کے لیے اخلاقی معیار کو بلند کرنا ہو گا۔

تحقیق کی حدود:

تخلیقی ادب اور ادبی تحقیق کی حدود میں حدِ فاصل قائم نہیں کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری تحقیقی روایت میں موضوعِ زیرِ تحقیق کے علاوہ سیاسی، سماجی اور تاریخی معلومات تو دستیاب ہو جاتی ہیں لیکن موضوع سے متعلق قطعی اور درست نتائج کم ملیں گے۔ قاضی صاحب نے ادب اور تحقیق کے درمیان حدِ فاصل قائم کی اور موضوعِ زیرِ تحقیق کی حدود میں رہ کر لکھا اور لکھنے پر زور دیا۔ ادب کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ''ادب کے مالہ وماعلیہ سے بحث کی جائے تو فلسفے کی حدود میں قدم رکھنا ناگزیر ہے، عمل تخلیق، یا ادب کی اثر اندازی کا ذکر آئے تو نفسیات سے دوچار ہونا لازمی ہے، اور اگر یہ بیان آجائے کہ کن حالات میں کسی خاص زبان کے ادب نے نشو و نما پائی، یا کون سے اسباب اس کی ترقی یا زوال کا باعث ہوئے، تو تاریخ سے واسطہ پڑنا یقینی ہے۔'' (۳)

قاضی صاحب کے تحقیقی مقالات اختصار کا بہترین نمونہ ہیں۔ اُن کی تحقیقات میں موضوعات عموماً قطعی ہوتے ہیں۔ تمہید اور غیر متعلق معلومات بہت ہی کم راہ پاتی ہیں۔ وہ لکھنے کا آغاز براہِ راست موضوع سے کرتے اور موضوع کے دائرہ کار سے سرِ مو انحراف کو تحقیقی ضابطے کے خلاف سمجھتے تھے۔ دو مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکے گا: مثلاً ''سالِ وفات آبروؔ'' کا پہلا جملہ یہ ہے:'' آبروؔ کے معاصر اور قریب العصر مصنفین کے لکھے ہوئے شعرائے اردو کے جو تذکرے، اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں، وہ آبروؔ کی سالِ وفات کی تعیین سے قاصر ہیں۔'' '' سالِ وفات حاتمؔ'' کا آغاز یوں ہے:'' شاہ حاتمؔ کے سالِ وفات کے متعلق حسبِ ذیل اقوال ہماری نظر سے گزرے ہیں '': تاریخی تحقیق میں اُن کے مضمون'' صوبہ بہار گیارھویں صدی کی اردو کا نمونہ'' کا پہلا جملہ یہ ہے:'' سیدھا راستہ دینیات کا ایک مختصر رسالہ ہے، جو حضرت عمادالدین قلندر کی طرف منسوب ہے۔'' قاضی صاحب کے طویل تحقیقی مقالات میں بھی موضوعِ زیرِ تحقیق پر استدلال کی کثرت ہی کی بدولت ہے۔ آزاد بحیثیت محقق، غالب بحیثیت محقق اور مولوی عبدالحق بحیثیت محقق کی طوالت استدلال کی وجہ سے ہے۔ قاضی صاحب عمومی رائے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ اُن کا طریقہ یہ رہا ہے کہ نمبر شمار کے تحت ایک ایک بیان پر جرح کرتے ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالات

طولانی عبارات کے بجائے نمبر شماری شقوں پر مبنی ہیں۔ شق بندی کا طریقِ کار انھیں موضوع زیر بحث کی حدود سے نکلنے نہیں دیتا۔

موضوع کا انتخاب:

عملی تحقیق میں قاضی صاحب نے، متن، صحتِ متن، لسانی جائزے، الحاقی اشعار، آوارہ گرد اشعار، شعرا کے حالات و واقعات کی تحقیق، تعینِ زمانہ اور روایات پر جرح تعدیل جیسے موضوعات پر دادِ تحقیق دی۔ جن طلبہ نے قاضی صاحب سے تحقیقی موضوعات کے انتخاب میں مدد چاہی، اُن کے لیے قاضی صاحب بیشتر اوقات کسی اہمیت کے حامل متن کی تدوین جیسے کام کی سفارش کرتے تھے۔ اُن کے مجوزہ موضوعات میں تدوینِ متن کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

قاضی صاحب علمی معاونت کو اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتے تھے لیکن عملی تحقیق کی جانچ میں سخت واقع ہوئے تھے۔ اساتذہ، طلبہ اور تحقیقی کام کرنے والوں کی مدد کرتے تھے۔ مقالہ نگاروں کی معاونت اور سرپرستی صرف اُسی صورت میں کرتے تھے جب انھیں یقین ہو جاتا تھا کہ مدد چاہنے والے میں تحقیق کی صلاحیت موجود ہے۔ پروفیسر شمیم احمد نے قاضی صاحب کی نگرانی میں ڈی فل کا مقالہ لکھا۔ اُنھوں نے قاضی صاحب تحقیق کی غرض سے ملاقات کی روداد بیان کی ہے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ قاضی صاحب تحقیق میں نگرانی کن شرائط پر قبول کرتے تھے:

"چلتے وقت میں نے گزارش کی کہ میں آپ کی نگرانی میں کوئی تحقیقی کام کرنا چاہتا ہوں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اس کام کے لیے کسی اور دن تشریف لائیے۔ میں پہلے جانچ کروں گا کہ آپ تحقیقی کام کر سکتے ہیں یا نہیں۔ جس روز آپ تشریف لائیں گے اُس روز صرف اسی موضوع پر گفتگو ہو گی۔ قاضی صاحب نے خود ہی دوسری ملاقات کی تاریخ متعین کر دی اور وقت بھی بتلا دیا۔ میں قبل ہی سن چکا تھا کہ قاضی صاحب بہت سختی کے ساتھ وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ لہٰذا وقت مقررہ کے چند منٹ قبل ہی پہنچ گیا۔ قاضی صاحب زینے سے نیچے اترتے دکھائی دیے۔ اُن کے ہاتھوں میں دو کتابیں بھی نظر آئیں۔ خیر و عافیت دریافت کرنے اور چائے نوشی کے بعد قاضی صاحب نے ایک کتاب کھولی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا" اس عبارت کو پڑھیے..." میں نے عبارت پڑھی۔ یہ میرؔ کے تذکرے نکات الشعرا کی عبارت تھی۔ میں نے تقریباً ایک صفحہ پڑھا ہو گا کہ قاضی صاحب نے رکنے کو کہا اور مفہوم سمجھانے کی فرمایش کی، میں نے مفہوم بیان کیا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے دوسری کتاب میرے سامنے رکھی

اور فرمایا کہ کہیں سے کتاب کھولیے اور اس کے اشعار پڑھیے۔ یہ افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی کا ایک قلمی نسخہ تھا۔ ایک ورق میں نے پڑھا ہو گا کہ روک دیا اور فرمایا کہ میں آپ کے مقالہ تحقیق کی نگرانی کو تیار ہوں لیکن موضوع میں دوں گا۔ آپ گھر واپس جانا چاہتے ہوں تو چلے جائیں۔ میں کسی موضوع کا انتخاب کر کے آپ کو آپ کے گھر کے پتے سے مطلع کروں گا۔ تب آپ آ کر کام شروع کر دیں گے۔ اس درمیان آپ اٹھارویں صدی عیسوی کے شعری قلمی نسخے جس قدر دستیاب ہوں پڑھتے رہیے، اس سے آپ کو اپنے کام میں مدد ملے گی۔

چند ہفتوں کے بعد قاضی صاحب کا خط موصول ہوا کہ آپ پٹنہ آ کر مجھ سے ملیں۔ میں حاضر ہوا تو قاضی صاحب نے دیوانِ یکر وایڈٹ کرنے کو کہا اور مقدمے میں ایہام گوئی پر مفصل بحث پیش کرنے کی تلقین کی۔ برٹش میوزیم کے نسخے کے متعلق فرمایا، میں منگوا دوں گا جو خرچ آئے گا آپ کو لکھ دوں گا، آپ بھجوا دیں گے۔ ان سارے مرحلوں کو طے کرنے میں بہت سا وقت گزر گیا۔ بالآخر قاضی صاحب کی نگرانی میں بہار یونیورسٹی مظفر پور میں میرا رجسٹریشن ہو گیا۔ اس کام پر مجھے بہار یونیورسٹی مظفر پور نے ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی۔

قاضی صاحب تحریروں کا باریک بینی سے مطالعہ کرتے اور بڑی سختی کے ساتھ جانچتے تھے۔ جانچ کے دوران میں ان پر طرح طرح کے نشانات لگاتے، جہاں انھیں شبہ ہوتا وہاں اصل عبارت سے دوبارہ ملانے کو کہتے ، بعض قلمی نسخوں کو توجہ سے پڑھنے کی فرمایش کرتے۔ دوبارہ ملاقات ہوتی تو اس پر سوالات کرتے اور دیکھتے کہ میں نے غور سے پڑھا ہے یا نہیں۔ قلمی کتابیں ہند و بیرونِ ہند کے کتاب خانوں میں بکھری تھیں۔ قاضی صاحب تاکید کر کے بیرونِ ہند کی ضروری کتابوں کی فوٹو کاپیاں منگواتے اور اندرون ملک کے کتاب خانوں میں مطالعہ کرنے کے لیے بھیجتے۔ واپس آنے پر سارے کاغذات بہت ہی توجہ کے ساتھ دیکھتے اور ضروری ہدایتیں دیتے۔ بڑی تعطیل میں نے کتاب خانوں کے لیے وقف کر دی تھی تاکہ موضوع کے مطالعہ میں کسی قسم کی کمی نہ رہ جائے۔ میں بلا جھجک کہتا ہوں کہ اگر قاضی صاحب ہمارے نگران نہ ہوتے تو میں نہ ان کو دیکھ پاتا اور نہ ان کمیاب اور قیمتی کتابوں کا مطالعہ ہی کر پاتا جن کے نام سے بھی اس وقت میں واقف نہ تھا۔ برٹش میوزیم لندن، انڈیا آفس لائبریری لندن، رام پور لائبریری، آصفیہ حیدر آباد، علیگڑھ یونیورسٹی لائبریری، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، نیشنل لائبریری کلکتہ وغیرہ کے نام میں نے سن رکھے تھے۔ قاضی صاحب کی بدولت وہاں کے مواد سے میں نے استفادہ بھی کیا اور تحقیق کے آداب و انداز سے آشنا بھی ہوا۔"[۴]

بہ قول پروفیسر مختارالدین آرزو:''وہ قیمتی کتابیں دینے میں بھی تامل نہیں کرتے اکثر و بیشتر وہ کسی موضوع کے لیے خود ہی کوئی کتاب تجویز کرتے ہیں اور خود ہی مہیا کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کتب خانے آپ کہاں جائیں گے معلوم نہیں وقت پر آپ کو ملے یا نہیں۔ میرا ذاتی نسخہ لے لیجیے گا، ایسی کتابیں اکثر واپس آجاتی ہیں لیکن کچھ کو اپنے نئے مالکوں سے ایسی دل چسپی ہو جاتی ہے کہ واپس نہیں آتیں۔ قاضی صاحب یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ کتاب کوئی معقول شخص لے گیا ہو گا تو واپس آہی گئی ہو گی۔ اب اگر سامنے کی الماری یا شیلف پر موجود نہیں تو لا محالہ صندوق میں کہیں بند ہو گی۔'' قاضی صاحب علمی کام کرنے والوں کی دل سے قدر کرتے تھے اور باوجود اس کے کہ وہ مجلسی نہ تھے ایسے لوگوں سے ملتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ پروفیسر حسن عسکری نے ۱۹۳۵ء کا واقعہ بیان کیا ہے: یاد نہیں زلزلے کے کتنے دنوں یا مہینوں بعد میں ایک روز اس کمرے میں میز کے مشرقی طرف کی ایک کرسی پر بیٹھا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ پیچھے کی طرف سے کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا، قاضی صاحب اپنے مخصوص انگریزی لباس میں ملبوس کھڑے تھے۔ استعجاب کی کچھ کیفیت طاری ہونے کو ہی تھی کہ'' آداب عرض'' کے بعد قاضی صاحب محض اتنے بچے تلے الفاظ زبان پر لائے: مجھے قاضی عبدالودود کہتے ہیں۔ میں بھنور پوکھر محلہ اور شاہ رشید اللہ وکیل کے مکان میں رہتا ہوں۔ کیا آپ آج شام کو میرے ساتھ چاء[کذا] کے لیے آئیں گے۔ میں سنبھل چکا تھا۔ کہا، بڑی خوشی سے حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔ وکیل صاحب کے دولت کدہ کو جانتا ہوں گو موصوف سے میری ملاقات نہیں... جب میں ان کے دولت کدہ پر پہنچا، بڑی کشادہ پیشانی اور انتہائی خلوص سے ملے۔ کہنے لگے کہ کالج کے اساتذہ شاذ و نادر ہی کتب خانہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ شاید آپ کا تعلق پٹنہ کالج سے ہے۔ میں جب کبھی جاتا ہوں تو آپ پر نظر پڑتی ہے۔ اس لیے خواہش ہوئی کہ آپ سے ملوں۔

حمیدہ سلطان نے لکھا ہے کہ ان کو تحقیقی معاملات میں ہر درجے کا ادیب دریافت طلب امور پر خط لکھ دیتا ہے اور وہ اس کا اتنی جلدی جواب دیتے ہیں کہ سوال کرنے والا ان کی اس عنایت پر متحیر رہ جاتا ہے۔ نئے لکھنے والوں کا وہ حوصلہ بڑھاتے ہیں اور جن اصحاب کو ان کی خدمت میں حاضری دینے کا موقع بارہا ملتا ہے وہ ان کی سیر حاصل معلومات کی بدولت نوٹ پر نوٹ تیار کر لیتے ہیں اور ذرا سی کوشش سے پوری کتاب مرتب کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ ان اصحاب کی کارگذاری جب قاضی صاحب کے سامنے آتی ہے تو بجائے کچھ کہنے سننے کے ایک ہلکی سی شفقت آمیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر آجاتی ہے، جیسے ایک بہت بڑا سرمایہ دار کسی گداگر کی جھولی میں چند سکے ڈال کر اطمینان بھری ہنسی ہنس دے۔

قاضی صاحب تحقیقی مقالات کے لیے موضوعات کے تعین سے لے کر تکمیلی مراحل تک معاونت کرتے تھے۔ یہ الگ بات کہ چند ہی لوگ ان کے مشوروں پر عمل پیرا ہوئے۔ ڈاکٹر حسنین مرزا محمد علی فدوی پر مقالہ کلیم الدین احمد کی نگرانی میں لکھنا چاہتے تھے۔ کلیم صاحب نے رہنمائی کے لیے قاضی صاحب سے مشورہ لینے کو کہا۔ بہ قول ڈاکٹر محمد حسنین قاضی صاحب نے موضوع کا تعین کرکے کام کے طریق کار سے متعلق یوں رہنمائی کی :

> مقصد دیوان ہے یا فدویؔ شاعر؟ امر غور طلب یہ ہے۔ حالات زندگی میں آپ کو کیا ملیگا؟ فدوی بڑے شاعر نہیں۔ معروفِ زمانہ بیشک تھے۔ چند معاصر تذکرہ نگار ان کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی آپ کے مآخذ ہیں، بس۔ ان سے زیادہ مواد کیا ملے گا؟ اپنے رقم کردہ حالات اگر دیوان میں مل جائیں تو امر دیگر ہے۔ اصل کام دیوان کی اڈیٹنگ ہے۔ دستیاب نسخوں سے کلام جمع کرنا ہے۔ تکیۂ عشق والا نسخہ مل جائے تو خوب ہے۔ ان نسخوں کا تفصیلی ذکر ہو گا۔ دیوان کی تدوین، مکمل صحتِ متن کے ساتھ۔ اختلافاتِ قرأت علاوہ۔ پھر فدویؔ تخلص کے دیگر شعرا کا کلام جو غلط طور پر ایک دوسرے سے منسوب ہے۔ زبان پر مفصل بحث ہو گی۔ بڑی صاف اور بامحاورہ زبان لکھتے ہیں۔ میر حسن سے ان کی دوستی تھی۔ خوش طبعی اور شیریں کلامی کا ذکر کرتے ہیں۔ علم موسیقی اور ستار سے بھی فدویؔ کو ذوق تھا، یہی وجہ ہے کہ مقبول انام کہا ہے اور نسخے مل جائیں تو اڈیٹنگ اچھی طرح ہو گی۔ میر حسن نے لکھا ہے کہ کلام اوائل را بہ آب شستہ، بعد ازاں خوب تر گفتہ۔ اغلب ہے فدویؔ نے یہی نسخہ رکن الدین عشق کی نذر کیا ہو۔ مرشد آباد ضرور جایئے۔ نگر سیٹھ کے یہاں یہ قیام کرتے تھے۔ عجب نہیں کہ ایک نسخہ وہاں بھی مل جائے۔"(۵)

موضوع کے تعین میں نقاد اور محقق کی رائے کا فرق ملاحظہ کیجیے، کلیم الدین احمد نے موضوع کا عنوان "کلیم الدین: مرزا محمد علی فدویؔ... عصر، حیات، شاعری اور کلام" منتخب کیا تھا۔ جب قاضی صاحب سے مشورہ لیا گیا تو عنوان میں تبدیلی کرکے " دیوانِ مرزا محمد علی فدویؔ دہلوی، حالاتِ زندگی اور شاعری" متعین کیا۔ ڈاکٹر

حسنین نے لکھا ہے کہ دونوں عنوانات پیش ہوئے۔ کلیم صاحب نے دیکھا چپ رہے۔ کئی دن تک اس موضوع پر بات نہ ہوئی۔ قاضی صاحب نے دیکھا، بولے، کلیم الدین احمد نقاد ہیں۔ فدوی کی شاعری پر وہ اپنے انداز سے سوچتے ہیں۔ کام بڑھ جائے گا۔ دیوان کی اڈیٹنگ آسان نہیں۔ عصر اور شاعری پر لکھنا مزید کام ہو گا۔ اس پہلو پر بھی توجہ رکھیے۔

قاضی صاحب کی عادت تھی کہ وہ کسی بھی موضوع پر لکھنا اس وقت شروع کرتے تھے جب موضوع سے متعلق سارا مواد ان کی دسترس میں آجاتا تھا۔ رہنمائی کے لیے بھی وہ اسی اصول پر کار بند تھے۔ طلبہ کے لیے کتب کی فراہمی اور مآخذ سے متعلق معلومات فراہم کرتے تھے۔ پروفیسر مختارالدین آرزو کی ایک خط مرقومہ ۲۹ نومبر ۱۹۵۲ء میں یوں رہنمائی کرتے ہیں:

> شفیق مکرم۔ مرسلہ کاغذات ملے، آپ کی نئی تحریر پرانی سے بہتر ہے، قبل والی وقتِ ملاقات۔ آپ ابھی اپنا مقالہ لکھنا شروع نہ کریں، ابھی مواد حسبِ دلخواہ جمع نہیں ہوا۔ اس وقت جو کام آپ کو کرنا ہے وہ دیوان کی ترتیب ہے اور اس میں کافی وقت صرف ہو گا۔ اس کے بعد دونوں دیوان سے الفاظ و محاورات وغیرہ کا نکالنا یہ بھی وقت لے گا۔ اس کے بعد بلو گریفی اور سب سے آخر میں حالات و تنقید۔ یہ مصالح پر مبنی ہے۔"(۶)

قاضی صاحب نے تدوینِ متن پر خصوصی توجہ دی۔ صحتِ متن کا شعور پیدا کیا، اختلافاتِ نسخ کو تحقیق کا موضوع بنایا، متن کے ممکن الحصول نسخوں کے تقابل سے اصل متن کی بازیافت، اختلاف کی نشان دہی، مصنف کے متعلق جملہ مآخذ کی معلومات اور اُن کا تجزیہ، مصنف کے حالات کے بارے میں قطعی معلومات کی تلاش اور اُس کی زبان پر خصوصی تحقیق وغیرہ، قاضی صاحب کی اولیات ہیں۔ موضوع کے انتخاب کے بعد تحقیق کے آغاز سے متعلق اُن کا کہنا تھا:

> "تحقیقات کو اس مقام سے شروع کرنا ہے جس نقطے پر اس کے پیش رو نے انتہا کی تھی۔ اس کے ہاں اعادہ تحصیل حاصل ہے۔ سب سے پہلے موضوع زیر بحث سے متعلق جس قدر مواد موجود ہو اُس پر عبور حاصل کرنا لازمی ہے، پھر واقعات کا تجزیہ

کر کے ایک مستحکم بنیاد پر اپنے نظریے کو قائم کرنا اس کا فرض ہے، معلومات انسانی میں ایک مستقل اضافہ کرنا مقصود ہے، ایسا جو اخلاف کی رہنمائی کا موجب ہو، اس کے نظریے مرورِ زمانہ سے باطل نہ ہو سکیں۔ تحقیق و تدقیق کا یہی ایک صحیح طریقہ ہے اور یہی ایک صحیح عالم اور محقق کا مسلک ہونا چاہیے۔ حالاتِ حاضرہ کا لحاظ، نسل و رنگ و مذہب کا امتیاز، ذہنی و مادی ترقیوں کا تفوق، یہ وہ چیزیں ہیں جو کبھی کسی محقق کے نظام عمل کا جزو نہیں بن سکتیں۔(۷)

قاضی صاحب کا خیال تھا کہ زبان و ادب کو درجہ کمال پر پہنچانے کے لیے لازمی ہے کہ اصول و ضوابط کے تحت مخصوص موضوعوں پر مبسوط مقالے اور رسالے شائع کیے جائیں۔ محققانہ اصول پر تنقید و تبصرہ کا کام انجام پائے، تاریخی تحقیق و تنقیدی تالیفات مرتب کی جائیں اور مستند و جامع تصانیف تحریر کی جائیں۔ تحقیقی مقالوں میں غیر متعلق معلومات سے گریز کر کے موضوع کی مختلف جہات کو تحقیق کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ تحقیق کے طالب علموں کے لیے اُن کا کہنا تھا:

"جو لوگ ذاتی تجربہ نہیں رکھتے ہیں انھیں مختصر موضوع تلاش کرنا چاہیے۔ موضوع زیادہ پیچیدہ نہ ہو، نیز تحقیقی کاموں کے لیے تجربہ کار لوگوں سے مشورہ لینا بھی ضروری ہے۔"(۸)

موضوع کے انتخاب میں دو اہم باتیں قاضی صاحب نے یہ بیان کی ہیں:

"موضوعِ تحقیق کے انتخاب میں اپنی صلاحیتوں کا لحاظ ضروری ہے، اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس سامان کی حاجت ہو گی، اس کی فراہمی لکھنے والے کے لیے ممکن ہے یا نہیں۔

بعض موضوعات ایسے ہیں کہ اُن پر آزادی سے کچھ لکھنا ضرر رساں ہو سکتا ہے، اگر اس کے لیے آمادہ نہیں تو ایسے موضوع پر قلم اُٹھانا، نا مناسب ہے۔ کسی محقق کے لیے یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ خوف اسے راست گفتاری سے باز رکھے۔" (اصولِ تحقیق)

مواد کی فراہمی:

تحقیق میں مواد کی فراہمی پہلا مرحلہ ہے۔ تحقیق کے لیے جس قدر اہم، تاریخی اور مستند مآخذ سے کام لیا جائے، نتائج اسی قدر بہتر نکالے جاسکتے ہیں۔ قاضی صاحب زیر تحقیق موضوع سے متعلق جملہ اہم مآخذ اور بنیادی مآخذ کے اہم نسخوں تک رسائی کو ضروری قرار دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک مسئلے سے متعلق جملہ مواد تک رسائی کے بغیر نتائج گمراہ کن ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے حد درجہ ذمہ داری ے مآخذ جمع کر کے اُن کی روشنی میں تحقیقی مقالات لکھے۔ اس اصول پر سختی سے پابندی کی وجہ سے اُن کے بہت سے تحقیقی منصوبے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ قاضی صاحب موضوع سے متعلق ممکنہ مواد کی جمع آوری سے پہلے کچھ لکھنا گناہ سمجھتے تھے، مواد کی جمع آوری سے متعلق ان کا کہنا تھا:

> ''تحقیق کے سلسلہ میں صرف وہی کتابیں نہیں دیکھنی چاہئیں جن کا موضوع سے براہِ راست تعلق ہو بلکہ ایسی کتابوں کا بھی مطالعہ ضروری ہے، جن میں موضوع سے براہِ راست بحث نہیں کی گئی ہو لیکن مواد اس میں موجود ہو۔ قلمی اور مطبوعہ دونوں نسخوں کا مطالعہ ضروری ہے اس لیے کہ ممکن ہے جو باتیں قلمی نسخوں میں ہوں وہ مطبوعہ میں نہ ہو، اس کے علاوہ مواد کے سلسلہ میں معاصرین اور مختلف اصحاب کی آرا کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ تحقیق مین کسی جزو کے چھوٹ جانے کا امکان نہ رہے۔''(۹)

محقق :

قاضی صاحب کے نزدیک محقق میں مزاجاً تفتیش اور تشکیک کا خصوصی ملکہ ہوتا ہے۔ زود یقینی اور غیر محتاط گفتگو کرنے والا شخص محقق نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے انھوں نے لکھا کہ مذہبی لوگ محقق اور نقاد نہیں ہوسکتے۔ بہت سے تحقیقی کام کرنے والے اُن کی نظر میں مزاجاً محقق نہ تھے۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے نقوش فروری ۱۹۵۷ء شخصیات نمبر میں قاضی صاحب کی شخصیت پر سب سے پہلا مقالہ لکھا۔ اُس مقالے میں اُنھوں جہاں قاضی صاحب کے متعلق بہت سی معلومات فراہم کیں وہاں سپیا کو اُن کا پسندیدہ آم قرار دیا۔ یہ باتیں عام تھیں لیکن چوں کہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے قاضی صاحب نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ آموں کی کم از کم قسمیں سپیا سے زیادہ پسند ہیں۔ مقالے پر تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے خط میں لکھا: ''ابھی آپ محقق نہیں ہوئے۔'' سچ

قاضی صاحب کو ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھا اس سے انحراف کو کسی صورت برداشت نہ کرتے تھے۔ بہ قول رشید حسن خاں قاضی صاحب کے نزدیک محقق کی بنیادی صفات یہ ہیں:

"دو اور اہم باتیں جن پر قاضی صاحب نے مسلسل زور دیا ہے اور اب وہ مسلمات میں سے ہیں: ایک تو یہ کہ تحقیق کے لیے مزاجی مناسبت ضروری ہے۔ یہ من جملہ شرائطِ تحقیق ہے۔ صرف علم کافی نہیں۔ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ آدمی پڑھا لکھا ہو یا بہت پڑھا لکھا ہو، لیکن منطقی استدلال کا خوگر نہ ہو، اور اس طرح وہ: شہادت اور جرح و تعدیل کا حق ادا نہ کر سکے (جن کے بغیر کوئی بات قابلِ قبول نہیں ہو پاتی؛ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو کہ حقائق کے تعین اور نتائج کے اخذ میں صحیح طریقہ کار سے کام نہ لے سکے؛ وہ اس سخت گیری کا حق ادا نہ کر سکے جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ تحقیق کو قبولِ عام سے دور کی نسبت ہے۔ یہ توقع کرنا کی تحقیقی تحریروں کو سب لوگ یا اکثر لوگ پسند کریں گے، تحقیق سے ناواقفیت کا اعلان کرنا ہے اور پست معیاری کو دعوت دینا ہے۔ تحقیق عام پسند چیز نہیں ہو سکتی، اُسی طرح جس طرح وہ آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ ایک بار ایک صاحب نے قاضی صاحب سے نیاز مندانہ شکایت کی کہ آپ کی تحریروں کو بعض اوقات سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ قاضی صاحب نے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ میں سب کے لیے نہیں لکھتا، آپ مت پڑھا کیجیے۔ مقصد یہ تھا کہ تحقیق کو آسان پسندی سے ربط نہیں ہو سکتا اور تحقیقی تحریروں سے کماحقہ فیض یاب ہونے کے لیے بھی مزاجی مناسبت ضروری ہے۔"(۱۰)

محقق کے فرائض:

قاضی صاحب نے محقق کے فرائض بیان کرتے ہوئے لکھا:

۱ قدیم و جدید مسلک کے حسن و قبح سے قطع نظر اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ تحقیق و تدقیق فی نفسہ صحیح تفحص و تجسس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت کا انکشاف صرف اسی طرح ممکن ہے۔ محقق کا عین

فرض ہے کہ وہ اپنی خیالات و میلانات سے علیحدہ ہو کر صرف اسی مواد پر انحصار کرے جو اس کے پیش نظر ہو اور قیاسات سے کام نہ لے۔

۲ ہر بات یکساں اہمیت نہیں رکھتی، لیکن بات اہم ہو یا غیر اہم، محقق کو حقِ تحقیق ادا کرنا چاہیے۔ بعض اوقات کوئی بات جو محض جزئی معلوم ہوتی ہے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ مزید یہ کہ اگر بے احتیاطی عادب بن گئی تو ان امور میں بھی جو خود لکھنے والے کی نظر میں اہم ہیں، اس سے گریز نہیں ہو گا۔ جونسن کا قول ہے کہ معاملہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اس کی تفاصیل کے بیان میں حقیقت سے جزوی انحراف بھی روا نہیں۔ بچوں کو اس کا خوگر بنانا چاہیے۔ مگر بہت احتیاط سے کام لیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی امر اگر ایک کھڑکی کے پاس ظہور میں آیا ہے اور بچہ یہ کہے کہ دوسرے کے پاس ہوا تو اُسے فوراً ٹوکنا چاہیے پتا نہیں حقیقت سے تجاوز کہاں پہنچا دے۔ قائم کے نام سے بحث کرتے ہوئے ایک کرم فرمانے لکھا کہ اس کا کوئی خاص نام اگر نہ ہوا تو اس سے قیامت نہ ٹوٹ پڑے گی۔ یہ بالکل صحیح ہے، لیکن قیامت تو قائم پیدا نہ ہوتے یا ہوتے ہی مر جاتے جب بھی نہ ٹوٹتی۔

۳ آداب و اخلاق ہر بات کے اہم اجزا ہیں۔ ممکن ہے کسی موضوع سے جذباتی تعلق ہو لیکن جذبات کی رو میں بہہ کر حقائق سے انکار یا گریز مناسب نہیں ہے۔ مصلحت ذاتی بھی ہوتی ہے اور قومی بھی۔ لیکن محقق کو مصلحت اندیش نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ Dr. Johnson اور Dr. Boswel نے اس مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ایک محقق ان باتوں پر غور نہیں کرتا تو پھر مضمون کا تعصب زدہ ہو جانا عین ممکن ہے۔

۴ تحقیق کے سلسلہ اظہار میں صاف گوئی لازمی ہے لیکن تمام لوگ متصور نہیں ہو سکتے۔ متصور کا تعلق ذاتی صلاحیتوں اور خود اعتمادی پر منحصر ہے۔ محقق ہونے کے بجائے "بن" جانا ہے۔ ایک خاص مزاج کا ہونا تحقیق کے لیے لازم ہے۔

تحقیق کی زبان:

"پیرائیہ اظہار تحقیق کا ظاہر ہے۔ اس لیے تحقیق کی عبارت اگر دلفریب نہ ہو سکے تو بہت خشک بھی نہیں ہونی چاہیے۔ عبارت ایسی ہونی چاہیے جو آسانی سے سمجھی جا سکے۔ دلفریبی ہو یا نہ ہو لیکن عبارت کا واضح ہونا تحقیقی مضامین کے لیے اشد ضروری ہے۔"

ادب اور تحقیق:

"محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے اور استعارہ و تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لیے کرنا چاہیے۔ آرائشِ گفتار کی غرض سے نہیں۔ اسما کے ساتھ صفات اسی وقت لانے چاہئیں جب کوئی صف لکھنے والے کی اصلی رائے کو ظاہر کرتی ہو۔ تناقض و تضاد اور ضعف استدلال سے بچنا چاہیے اور مبالغے کو تحقیق کے لیے سم قاتل سمجھنا چاہیے۔ محقق کا مطمع نظر یہ ہونا چاہیے کہ کم سے کم الفاظ میں پڑھنے والے پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کر دے، یہ غلط ہی کیوں نہ ہو، مگر اسلوب بیان ایسا ہو کہ شبہے کی گنجائش نہ رہے۔ اس سلسلے میں ناظرین سے روبرٹ گریوز اور ایلن ہوج کی کتاب "دی ریڈ اوور یور شولڈر" کے مطالعے کی سفارش کروں گا۔

قاضی صاحب نے عملی تنقید میں بیان پر جو اعتراضات کیے، ان کی چند مثالوں سے بات واضح ہو گی:

الف　شبلی کی جو کتاب عالمگیر پر ہے، اس کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے: "فلسفہ تاریخ کا ایک راز ہے کہ جو بات جتنی مشہور ہوتی ہے، اتنی ہی غلط ہوتی ہے۔" یہ صریحاً غلط ہے اور شبلی یہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ شہرت صحت کی ضامن نہیں ہوتی۔

ب　محمد حسین آزاد آبِ حیات کے ترجمہ مظہر میں اردو لکھتے لکھتے یکایک فارسی پر اتر آتے ہیں، جس سے پڑھنے والے کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ فارسی عبارت کہیں سے نقل ہوئی ہے، حالاں کہ وہ خود انھی کی زائیدہ فکر ہے۔ اس سے قطع نظر فرماتے ہیں: " قاتل صبیح و ملیح بود" کوئی شخص بیک وقت صبیح و ملیح نہیں ہو سکتا، اور یہ اس کا محل نہیں کہ ملیح خوبصورت کے معنی میں آسکے۔

ج　یہی بزرگ [محمد حسین آزاد] دبیر کے حال میں ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "خاندان کے بارے میں نہ یقین ہے نہ شک" اگر یقین نہیں تو شک لازم ہے۔

ہ　بحث یہ ہے کہ اسدی نے لغت لکھی تھی یا نہیں۔ غالب فرماتے ہیں: "اگر اسدی طوسی نے فرہنگ لکھی ہوتی تو محمود غزنوی کے عصر سے آج تک سب فرہنگ نگاروں کا ماخذ وہی ہوتا اور اختلاف لفظ و معنی راہ نہ پاتا، لیس فلیس۔" (تیغ تیز طبع ۲ ص۲۶۸) اس سے قطع نظر کہ فرہنگِ مذکور محمود غزنوی کے بعد کی تالیف ہے، وہ ایک مختصر سی کتاب ہے، جس میں خاص خاص لغات درج ہیں، اور عموماً حرکات و سکنات سے بحث نہیں ہوئی۔ اگر جامع فرہنگ بھی ہوتی اور اس میں نہجِ جدید کے مطابق فرہنگ نگاری کا حق ادا

کیا گیا ہو تا جب بھی الفاظ کی شکل و معنی میں اختلافات بعد کو پیدا ہو سکتے تھے، میں نے اس معاملے میں طویل تر بحث غالب بحیثیت محقق طبع ثانی میں کی ہے، اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

و　"امیر تخلص نام محمد یار خاں بن محمد علی خاں روہیلہ" یہ عبارت گلشن ہند مؤلفہ حیدری کی ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر مختارالدین احمد نے اس پر حاشیہ لکھا ہے:" صحیح نام علی محمد خاں ہے، سال وفات بعد از ۱۱۸۸ھ "ص ۳۰ پڑھنے والا اگر اس نتیجے پر پہنچے کہ مرتب نے علی محمد خاں کا سال وفات دیا ہے تو وہ بالکل حق بجانب ہو گا۔ مگر یقین ہے کہ مرتب نے امیر کا سنہ رحلت بتایا ہو گا، باپ کا انتقال ۱۱۸۸ھ سے کم و بیش تیس سال قبل ہوا تھا۔ خود امیر کا بھی سال وفات یہ ہے یا اس سے کسی قدر مختلف۔ اس کے متعلق کتابوں کی طرف رجوع کیے بغیر کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔

ذ　"لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر علماء و فضلا کا ایک بہت بڑا مرکز کاکوری رہا ہے۔"(تحریر شمارہ ۱، ص ۱۲۹) "بہت بڑا" محض برائے آرائش ہے، صرف مرکز، لکھنا تھا۔

ح　تحریر ص ۱۳۰ میں ساحر کاکوروی کے " مشہور شاگردوں " کے جو نام دیے ہیں۔ اُن میں اصحابِ ذیل بھی ہیں۔ مومن علی خاں مفتوںؔ، محی الدین خاں ذوقؔ، حیدر بیگ کاکوروی۔ یہ مسلم کہ بعض باتوں میں ان کے نام آئے ہیں، مگر اس کی بنا پر انھیں "مشہور" کہنا اس لفظ کا سوء استعمال ہے

ط　آبِ حیات میں ایک جگہ یہ مرقوم ہے کہ ضاحک بہ قول صاحب گلزارِ ابراہیم ۱۱۹۶ھ میں زندہ تھے۔ اور دوسری جگہ بغیر اس کے کہ قول مذکور کی طرف اشارہ بھی ہو، بے تکلف لکھا گیا ہے کہ سوداؔ ان کی موت کے بعد زندہ تھے۔ یہ آزاد کے مسلمات سے ہے کہ سوداؔ ۱۱۹۵ھ میں فوت ہوئے اور یہ صحیح بھی ہے۔

ک　غالبؔ باستثنائے خسرو کی ہندوستانی فارسی گو کو نہیں مانتے اور کسی کی فارسی دانی کے قائل نہیں، لیکن تیغِ تیز کے آخر میں جو سوالات ہیں، ان کے جوابات کے طالب ہندوستانیوں سے ہیں، جواب شیفتہ نے دیے ہیں اور حالی و نیر و سعادت علی نے اُن کی تصدیق کی ہے، پہلے تین شخص خود غالب کے شاگرد ہیں اور چوتھے آج بالکل گمنام ہیں اور اُن کی فارسی دانی کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس میں جو معنوی تناقض ہیں، اس پر غالب کی نظر نہیں پڑی۔"(اصولِ تحقیق)

سند اور حوالہ:

"اگر کوئی کتاب مصنف کی زندگی میں ایک بار سے زائد چھپی ہو، تو اس کی صحیح شکل وہ ہے جو آخری بار چھپی ہے، بشرطیکہ اس میں اگر تغیرات ہوئے ہیں تو اس کا ذمہ دار خود مصنف ہو، کسی دوسرے شخص کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس کتاب کی رد کردہ اشاعتوں کے اقتباسات بطور سند پیش کرے۔ کتاب کا مفصل حال بیان کرنا اور اس کی مختلف اشاعتوں سے بحث ہو تو یہ اور بات ہے۔ میرے ایک کرم فرمانے میری توجہ اس طرف منعطف کرائی ہے کہ میں نے معاصر میں فضلی کی کربل کتھا کے بارے میں گارسیں دتاسی کی ادبیاتِ ہندوی و ہندوستانی کے حوالے سے جو ایک بات لکھی تھی وہ خواجہ احمد فاروقی کے بیان کے بموجب اس میں بالکل مختلف طور پر ہے۔ اس کتاب کی دو اشاعتیں ہیں، اور میرا ماخذ اشاعتِ ثانی ہے۔ مگر مضمون کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے میں یہ نہیں بتا سکتا کہ صراحتہً یہ مذکور ہے یا نہیں۔ میں دونوں اشاعتوں کے اختلافات سے متعلق ایک مقالے میں بحث کر چکا ہوں۔ اور خود خواجہ احمد فاروقی کی فرمایش پر دلی کالج اردو میگزین کے لیے میں نے کریم الدین اور گارساں دتاسی کے عنوان سے جو مقالہ تحریر کیا تھا۔ اس میں جلد ثالث کا حوالہ بھی ہے جو صرف اشاعتِ ثانی میں ہے۔ میں نے اپنے کرم فرما کو دتاسی کی فرانسیسی عبارتیں بھیج دیں اور یہ لکھا کہ آپ خود دیکھ لیں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے یا غلط۔ مجھے اب تک اس کا موقعہ نہیں ملا کہ اشاعت کے عبارات متعلقہ کو دیکھوں، لیکن قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ انھیں کسی شخص نے انھیں کا ترجمہ دیا ہے، اور وہ اس کی بنا پر معترض ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے تو سمجھ نہیں آتا کہ انھیں یہ توقع کیوں تھی کہ میں اشاعتِ ثانی کو چھوڑ کر اشاعتِ اول سے مطالب پیش کروں گا۔"

"تحقیق میں کوئی بات سند یا حوالے کے بغیر قابلِ اعتبار نہیں ہوتی، لیکن تحقیق محض حوالوں کی جمع آوری کا نام نہیں ہے۔ حوالہ جات کے بارے میں محقق کو معلوم ہونا چاہیے کہ کن امور میں حوالہ دینا ضروری ہے اور کہاں غیر ضروری۔ قاضی صاحب نے حوالوں کی بابت لکھا ہے: بعض اصحاب کو حوالوں سے چڑ ہے۔ ہماری زبان کے ایک تبصرے میں اس پر اظہارِ مسرت کیا گیا تھا کہ کتاب حوالوں سے گرانبار نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر بیان کے لیے حوالوں کی ضرورت نہیں۔ مثلاً آپ یہ بتائیں کہ برطانیہ کی راجدھانی لندن ہے یا یہ کہیں کہ چند سال قبل پاکستان و ہندوستان میں لڑائی ہوئی تھی، اور سند میں کتاب کا حوالہ دیں، تو یہ مضحکہ خیز فعل ہو گا۔ لیکن اگر آپ کوئی نئی بات کہیں تو ماخذ کا ذکر ضروری ہے۔ تحقیقی مقالات میں ایسے معروف امور جو موضوع سے تعلق نہیں رکھتے اور جن کا ذکر ضمناً آ گیا ہے، ہر دعوے کی سند لازم نہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ غالب کے حالاتِ زندگی پر مفصل مقالہ لکھ رہے ہیں تو نام، ولدیت

،جائے پیدایش سی معمولی باتوں کی بھی سند دینی ضروری ہے۔ بعض اصحاب ان امور کی تو سند دیتے ہیں، لیکن نئی باتیں حوالے کے بغیر لکھنے میں قباحت نظر نہیں آتی۔ میں اس پر اعتراض کر چکا ہوں، لیکن لوگ اب بھی اس سے باز نہیں آتے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے وفاؔ کے بارے میں کچھ باتیں سند کے ساتھ لکھنے کے بعد یہ بات بدون حوالہ بتائی کہ وہ ۱۹۲ھ میں فوت ہوا تھا۔ (گلشنِ ہند، ص ۹۶) کم از کم میرے علم میں تو اس کی کوئی سند نہیں، ان کے علم میں ہے تو اسے قلم انداز نہ کرنا تھا۔"

الحاق اور اختلافِ نسخ:

"شاہنامہ فردوسی کے بعض نسخوں میں گرشاسپ نامۂ اسدی کا، کل نہیں تو اس کا معتد بہ حصہ داخل ہو گیا ہے۔ ایسے نسخے بھی موجود ہیں جن میں برزد نامہ کے ہزاروں شعر شامل ہیں۔ یہ تو الحاقی کلام ہے، اشعار کا متن بھی مختلف نسخوں میں اس قدر متفاوت ہے کہ کسی نے مبالغے کے ساتھ یہ کہا ہے کہ کسی شعر کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی اصلی شکل میں ہے۔ کاتبوں نے اشعار کو اپنے عہد کی زبان کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے اور اپنے مذہبی عقائد بھی اس کے سر تھوپے ہیں۔ کلیاتِ انوری طبع ہند میں ایک ہندوستانی شاعر کے قصائد داخل ہو گئے ہیں۔ اس کے بعض اشعار اس کے ہندوستانی ہونے پر بھی مشعر ہیں، اور ان کی بنا پر الحاق کے امکان کو نظر انداز کر کے ظفر علی خاں نے انوری کے ہندوستانی ہونے کا دعویٰ کیا۔ ظہیر فاریابی کے دیوان کے جو نسخے ایران میں چھپے ہیں، الحاقی کلام سے خالی نہیں اور نول کشوری کلیات کے آخر میں جو دیوان غزلیات ہے، وہ تو یک قلم بہت بعد کے ایک شاعر ظہیر اصفہانی کا ہے۔ دیوانِ حافظ کے کم نسخے ہیں، جن میں دوسروں کے کلام شامل نہ ہو۔ اردو میں سودا کے کلیات مطبوعہ میں میر سوز کی سو سے زیادہ غزلیں داخل ہیں، اور ناقدین کرام کلام سودا کی خصوصیات کے بیان میں بے تکلف اُن سے کام لیتے رہے ہیں۔ نثر پر بھی کاتبوں کا کرم رہا ہے۔ دبستانِ مذاہب کے نولکشوری نسخوں میں ایک جگہ، ایک عبارت ہے، جس سے قبل "فقیر آرزو می گوید" مرقوم ہے آرزو نے کسی نسخے کے حاشیے یا بین السطور ہیں وہ عبارت لکھدی ہو گی، کاتب نے اسے جزو کتاب سمجھا۔ خود مصنف بھی ردوبدل کرتا رہتا ہے۔ اس کی مستند شکل، آخری شکل ہے جس کی کتابت کے بعد مصنف نے کسی قسم کا تغیر نہیں کیا۔ حاصل بحث یہ کہ اس آخری شکل کی، تلاش ہونی چاہیے۔ یہ نہ ملے تو اس نسخے سے کام لیا جائے جس میں الحاق کا احتمال مقابلۃً کم ہے۔"

کل ماخذ سے رجوع کے بغیر قطعی رائے سے گریز:

"میں نے معیار (پٹنہ) میں جس کا میں خود مدیر تھا ادارہ معیار کی طرف سے کسی شخص کے اس قول پر اعتراض کیا تھا کہ " محمد عابد دل عظیم آبادی، برادر محمد روشن جوشش کے باب جسونت رائے ناگر تھے۔"... لیکن مجھے شورش و ابوالحسن امر اللہ کے تذکروں کی طرف رجوع کیے بغیر قطعی طور پر اس کی تردید نہ کرنی تھی۔ ان دونوں تذکروں سے دونوں بھائیوں کا ولد جسونت رائے ناگر ثابت ہوتا ہے اور لطف یہ کہ خود مبتلا کے تذکرے میں یہ عبارت ہے جو اپنی اہمیت کے باوجود اقتباساتِ مذکور میں قلم انداز ہو گئی تھی:" فرزندانِ جسونت رائے ناگر است۔ چوں بحد تمیز رسید بشرف دین احمدی مشرف گشت۔" کل اہم مآخذ کی طرف رجوع کیے بغیر قطعی طور پر رائے قائم نہ کرنی چاہیے۔"(اصولِ تحقیق)

خاموشی اور عدم تردید صحت کی دلیل نہیں:

"بات کتنی ہی قابلِ ذکر کیوں نہ ہو، اگر کوئی مصنف اس کے بارے میں خاموش ہے تو اس سے لازماً وہ بات غلط نہیں سمجھی جا سکتی۔ مزید یہ کہ اگر کسی شخص کے سامنے کوئی بات کہی جائے اور وہ شخص اس کی تردید نہ کرے، تو لازماً اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ میرے ایک دوست صالح شیعہ تھے، ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں کسی مذہب کو نہیں مانتا حتیٰ کہ خدا کا بھی قائل نہیں۔ اُسے دو چار دن گزر گئے تھے کہ بعض شیعی اصحاب کے سامنے انھوں نے مجھ سے اس کی تصدیق چاہی کہ وہ تبرائی شیعہ ہیں اور میں خاموش رہا۔"

تحقیق میں حافظے پر بھروسا:

"آقائے پور داؤد نے قزوینی کی یادداشتوں کے مجموعے کا دیباچہ لکھا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ قزوینی نے مرزبان نامہ کی ترتیب و تصحیح میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ لیکن ان کا مرتبہ نسخہ ایران پہنچا تو بہت سی غلطیاں نکالی گئیں۔ قزوینی کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے عہد کیا کہ سورہ اخلاص کی آیت بھی آیندہ نقل کرنی ہو گی تو دیکھ لوں گا قرآن میں کس طرح ہے۔ ظاہر اًسب یا بیشتر اغلاط کا ذمہ دار اُن کا حافظہ تھا۔ انھوں نے اس پر اعتماد کیا، اور اُس نے دھوکہ دیا۔"

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی دیوانِ بیان کی ترتیب میں مصروف تھے، میں نے انھیں لکھا کہ اس کے دو نسخے کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں ہیں۔ انھوں نے تفاصیل طلب کیے۔ میں نے ایک کرم فرما کو زحمت دی کہ وہ اس کتابخانہ کی فہرست میں دیکھ کر تفاصیل سے مطلع کریں، ان کا جواب آیا کہ اس فہرست میں دیوانِ بیان کے کسی نسخے کا

ذکر نہیں۔ میں اس سے مطمئن نہیں ہوا۔ اور میں نے ڈاکٹر مختارالدین احمد سے جو اس زمانے میں مقیم انگلستان تھے، اس بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ بیان تو نہیں، لیکن بیدار کے دیوان کے دو نسخے وہاں ہیں۔ احمد کی پگڑی محمود کو پہنا دینا حافظے کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

میں نے اپنے ایک مضمون ''سالِ وفات مصحفی'' میں لکھا تھا کہ اسیر کے دیوانِ فارسی میں مصحفی کی وفات کا قطعۂ تاریخ ہے، مگر جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اضافہ کر دیا تھا کہ یہ قول حافظے پر مبنی ہے۔ بہر حال بعد کو جب دیوان کی طرف رجوع کیا تو قطعہ مذکور اس میں نہ ملا۔

میں نے مدیر نقوش کی فرمایش سے نقوش کے آپ بیتی نمبر کے لیے اپنے حالات لکھے تھے۔ اور اپنے بزرگوں کے ذکر میں حافظے پر اعتماد کیا تھا۔ مجھ سے ایک فاحش غلطی ہو گئی کہ میں نے نسب نامے میں ایک نام ہی چھوڑ دیا۔ میر حسن نے جو مختصر نسب نامہ دیباچہ کلیات اور تذکرہ شعرا میں دیا ہے وہ اس باب میں متفاوت ہے کہ ایک میں ایک نام زیادہ ہے حالاں کہ دونوں جگہ خاتمہ میر امامی پر ہوتا ہے، کمی کا ذمہ دار حافظہ معلوم ہوتا ہے۔

غبارِ خاطر شائع کردہ ساہتیہ اکیڈمی کے حواشی نوشتۂ مالک رام میں دکھایا گیا ہے کہ ابوالکلام آزاد کا نقل کردہ متن بکثرت غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ حافظے نے دھوکا دیا۔ اسی کتاب میں مرقوم ہے: ''مظہر اور درد فن موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرض اصلاح پیش کرتے اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو بھی اپنے کمالِ فن کی سند تصور کرتے۔'' (ص ۲۷۲) درد کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کلاً صحیح ہے یا نہیں، اس سے اس وقت بحث نہیں۔ مظہر کی مہارت موسیقی کا ذکر غبارِ خاطر کے سوا کہیں میری نظر سے نہیں گزرا اور جو بات ایک کے متعلق کسی حد تک صحیح تھی، حافظے نے دو پر چسپاں کر دی۔ درد و مظہر میں شاعری اور درویشی مشترک تھی حافظے نے ایک اور امر میں اشتراک پیدا کر دیا۔

نوائے کیمبرج نام کا ایک اردو رسالہ کیمبرج سے نکلا تھا اور مسٹر بشیر حسین زید اس کے بانیوں میں سے تھے۔ میں ۱۹۲۳ء میں کیمبرج پہنچا تو اس وقت تک اس کے دو شمارے شائع ہو چکے تھے۔ زیدی صاحب سے اس کے متعلق گفتگو ہوئی تو یہ معلوم ہوا کہ تیسرے کی فکر ہے۔ اس کے چند ماہ بعد وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ اور نوائے کیمبرج بند ہو گیا۔ مدتوں بعد مجھے اس کا شمارہ اول ملا اور میں نے اس پر ایک مضمون لکھا جس میں زیدی صاحب کے ایک مضمون کا طویل اقتباس شامل تھا۔ یہ مضمون ان کی نظر سے گذرا، اور اس کے بارے میں میری ان کی بات چیت بھی ہوئی۔ اس وقت تو نہیں لیکن بعد کو نہ جانے کس طرح وہ مجھے اپنے ساتھ اس رسالے کے بانیوں میں سمجھنے

لگے۔ میں نے اس کی تردید کر دی، لیکن لاحاصل۔ ابھی چند روز ہوئے اس کا ذکر آیا تو انھوں نے پھر وہی بات ظاہر کی ہے کہ یہ حافظے کا دھوکا ہے۔

حافظہ دھوکا دیتا ہے، لیکن کسی حد تک اس پر بھروسہ کیے بغیر چارہ نہیں۔ ورنہ آپ کو اپنا نام بتاتے وقت اپنا آڈینٹٹی کارڈ جس پر آپ کا عکس بھی ہو، دیکھ لینا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ کب بھروسہ کیا جائے اور کب نہیں۔ اس کا اطمینان بخش جواب مجھے نہیں معلوم۔ دو باتیں اس سلسلے میں البتہ کہہ سکتا ہوں۔ ایک یہ کہ ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا حافظہ کن معاملات میں قوی اور کن معاملات میں ضعیف ہے۔ مجھے سینکڑوں سنین جن کا تعلق تاریخ ادب اردو سے ہے، یاد ہیں، لیکن ایک کے سوا کوئی ٹیلی فون نمبر مجھے یاد نہیں، اور وہ خود میرا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن امور کے لیے حوالہ ضروری ہے، وہاں بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، اور کوئی بات ماخذ کی طرف رجوع کیے بغیر نہیں کہی جائے یہ ممکن نہ ہو تو یہ صراحت کر دی جائے کہ حافظہ پر اعتماد کیا گیا ہے۔"(اصولِ تحقیق)

صحتِ متن:

قاضی صاحب نے تحقیق میں صحتِ متن پر شک کی روایت ڈالی۔ عام طور پر قدیم کتابوں کی معلومات کو مستند سمجھا جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے اس کے برعکس قدیم ماخذ کے متن کی تحقیق کو ضروری قرار دیا۔ اپنے مضمون "صحت متن" میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایل ایس اسٹینگ نے اپنی کتاب "اے موڈرن انٹروڈکشن ٹو لوجک" کے ایک باب میں جس کا عنوان "میتھڈ اِن ہسٹوریکل سائنسز" ہے قدیم نوشتوں کے متن سے بحث کی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اصل متن بطور شاذ ہم تک پہنچا ہے۔ عموماً نقل در نقل پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ آج کل کی چھپی ہوئی کتابیں مصنفین اور اہلِ مطبع کی احتیاط کے باوجود اغلاطِ طباعت سے خالی نہیں ہوتیں، تو کیا تعجب ہے اگر کم فہم اور ناقابل کاتبوں کے لکھے ہوئے مخطوطات اغلاط سے مملو ہوں۔ ان اغلاط کی تصحیح اور صحتِ متن کی تیاری وہی لوگ کر سکتے ہیں جن میں اعلیٰ درجے کا علم اور بصیرت موجود ہو۔ سقیم متن کی اطمینان بخش تصحیح کی صلاحیت کمیاب ہے۔"(۱۱)

قاضی صاحب نے اپنے تنقیدی تبصروں میں بکثرت متن کی اغلاط کی نشان دہی کی۔ تحقیقی مقالات میں جہاں انھیں مخطوطات سے کام لینا پڑتا تھا وہاں وہ احتیاطاً ''بشرطِ صحت'' کے الفاظ ضرور لکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک تحقیق میں متن کی صحت کا خیال رکھنا محقق کا بنیادی فرض ہے۔ اگر کسی دوسرے کی نظم و نثر نقل کی جائے تو صحتِ متن کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایک ہی کتاب میں بلاوجہ کوئی شعر یا عبارت نثر مختلف طور پر ملے تو بہت بیجا معلوم ہوتا ہے۔ میر ضمیر کا ایک شعر '' تحریر'' کے ایک ہی مقالے میں دو طرح نظر آتا ہے:

دس میں کہوں، سو میں کہوں، یہ درد ہے میرا　　اس طرز میں جو کہوے سو شاگرد ہے میرا (ص ۴۴)

دس میں کہوں، سویں کہوں، یہ ورد ہے میرا　　اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا (ص ۴۱)

دانش گاہ علی گڑھ کے شعبہ اردو کی طرف سے تاریخ ادبیات اردو کی جو پہلی جلد شائع ہوئی تھی، اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ عبارت نثر ہو یا شعر ایک سے زیادہ مقام پر نقل ہوا ہے تو مستثنیات سے قطع نظر اختلاف متن ضروری ہے۔

معاصر شہادت کی پرکھ

تحقیق میں معاصر شہادت کو بڑی اہمیت ہے، لیکن معاصرین بھی غلطیاں کر سکتے ہیں، مثلاً

الف　دہلی سے ایک رسالہ ہما نکلتا ہے۔ اس کے ایک شمارے میں مرقوم ہے: جناب ذاکر حسین جس زمانے میں دانش گاہ برلن کے متعلم تھے، ایک استاد سے ٹکرا گئے۔ اس کی زبان سے صرف ایک لفظ گدھا کو، موصوف نے (اس کی مدعا کے خلاف اس کا یہ مطلب لیا کہ وہ اپنا تعارف کرا رہا ہے۔ اور گدھا اس کا نام ہے۔) فوراً کہا ذاکر حسین۔ وہ بہت خوش ہوا اور ان کا دوست بن گیا۔ مسٹر نور الدین احمد مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے موصوف سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا، انھوں نے کہا کہ یہ جرمنی کا پرانا لطیفہ ہے، میرا، اس سے کوئی تعلق نہیں۔

ب　ڈاکٹر مختارالدین احمد نے پٹنہ کی ادبی صحبتوں پر جو مقالہ نقوش میں تحریر کیا تھا، اس میں جناب شاہ محمد حسن نے بسمل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ داغ کے شاگرد تھے۔ اُن سے ان کی ملاقات ہوگی اور مشاعروں میں بھی دیکھا ہوگا۔ لیکن وہ نظر تو نہیں آتے کہ داغ کے شاگرد سمجھے جا سکیں۔ وہ میرے رشتہ دار ہیں اور کسی زمانے میں ہم محلہ بھی تھے۔ داغ کی مفارقت کے وقت وہ چار سال کے ہوں گے۔

استادی شاگردی کا کیا سوال ہے۔ قیس مرحوم نے شاد عظیم آبادی پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انھوں نے شاگردِ شاد بتایا ہے، اور یہی صحیح ہے۔

ج　اسی دوران میں شاہ ولی الرحمن ولی مرحوم کی نسبت لکھا ہے کہ اختتام ملازمت کے بعد اپنے وطن کاکو میں مقیم ہیں۔

وقتِ اشاعت سے دو تین سال قبل ان کی وفات ہو چکی تھی۔ اور اختتام ملازمت سے بہت قبل وہ پٹنہ میں تو طن گزیں ہو چکے تھے۔

د　اس مضمون میں شید اشاگردِ شادؔ کو مادر زاد اندھا لکھا ہے۔ آخر میں اندھے ہو گئے ہوں گے ہر گز مادر زاد اندھے نہ تھے۔

ہ　انھوں نے [مختارالدین آرزو] نے میرے متعلق جو مضمون نقوش میں لکھا ہے اس میں بکثرت غلط باتیں درج ہیں۔ ان میں سے بعض کی تردید کر چکا ہوں۔

و　دبدبۂ امیری میں جو پٹنہ میں لکھی گئی ہے ریاض حسن خیال کو جو اس کی اشاعت کے وقت زندہ اور مقیم پٹنہ تھے، مرحوم کہا ہے اور شاگردِ امیر بتایا ہے۔ وہ خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں امیر نہیں، داغ کا شاگرد ہوں۔ واضح رہے کہ وہ کسی طرح غیر معروف نہ تھے، اور مختلف طبقات کے بکثرت اصحاب ان سے واقف تھے۔ لیکن مصنف دبدبۂ امیری سے عظیم آبادی ہونے کے باوجود ان کے بارے میں فاحش غلطیاں سرزد ہوئیں۔

ز　کہا جاتا ہے کہ گھر والے گھر کا حال بہتر جانتے ہیں مگر کچھ ضروری نہیں کہ وہ اپنے یا اپنے بزرگوں کے متعلق جو کچھ لکھیں، وہ صحیح ہو۔ غالبؔ اپنے کو ترک ایبک کہتے ہیں۔ لیکن ایبک ترکوں کی کوئی قسم ہی نہیں۔ شادؔ عظیم آبادی نے اپنا سلسلۂ نسب حسین فیروزی شاہِ شیراز معاصر حافظ سے ملایا ہے۔ اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا، وہ ذاتی اور خاندانی آوازہ گری میں کس حد تک جا سکتے تھے... ایک بزرگ کے متعلق ان کے بیٹے نے لکھا ہے کہ انھوں نے ۵ جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی تھی، جس کی بدولت عالمِ اسلامی میں مشہور ہو گئے۔ شہرت اگر اس کا نام ہے کہ بیٹا اس سے واقف ہو تو اور بات ہے، ورنہ یہ بات کسی اور نے نہ دیکھی ہے، اور نہ کسی شخص نے جو ناقل شخص نہیں ہے، اس کا ذکر کیا ہے۔

محقق کی فن قافیہ سے واقفیت

غالب نے قاطع برہان طبع ثانی میں 'لفظ آتش' کے مفتوح التا ہونے کی سند میں ایک رباعی اور ۴ فردیات پیش کیے ہیں۔ رباعی کے مصرع آخر میں آتشی بطور قافیہ آیا ہے۔اور اس کی بیت اول کے قوافی شیر وشی اور 'عصاکشی' ہیں۔ افراد میں سے ایک کا مصرع آخر یہ ہے: ولیکن دلم از تو در آتش است" مصرع اول کا قافیہ خوش ہے۔ ایک اور فرد کی ردیف است ہے، اور قوافی آتش وہیزم کش۔باقی دو میں سے ایک کے قوافی غمکشی اور آتشی، اور دوسرے کے ملوکش مادر آتش ہیں" (قاطع برہان مرتبہ راقم ص۱۶) فرد آخر کے علاوہ کوئی بیت فتح تا کی سند نہیں ہو سکتی، وجہ یہ ہے کہ اور ابیات میں حرفِ روی ش متحرک ہو کر حرفِ وصل سے مل گیا ہے، اور یہ فن قوافی کے مسلمات سے ہے کہ اس صورت میں حرفِ ماقبل روی کی حرکت وہ حرکت نہیں جس کی تکرار واجب ہے۔ غالب نے گرفت کے فتحہ را کے ثبوت میں ایک ایسا شعر بھی دیا ہے جس میں گرفتہ رفتہ کا قافیہ آیا ہے۔ اس میں بھی ت (حرفِ روی) حرفِ وصل سے مل کر متحرک ہو گئی ہے، اور اس شعر سے یہ ثابت کرنے میں مدد نہیں مل سکتی کہ حرفِ ماقبل روی یعنی ر کی حرکت کیا ہے۔ ہدایت صاحب مجمع الفصحا سے بھی اس قسم کی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اور میں نے اپنے کسی مضمون میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے محققین کے لیے فن قافیہ سے واقفیت ضروری ہے۔

نظم پر کام کرنے والے محقق کے لیے موزوں طبع ہونا ضروری ہے:

غالب نے تیغ تیز میں جو آغا علی کی موید برہان کا رد ہے، لکھا ہے:" یہ مصرع استاد کا جو حضرت نے لکھا ہے، اس کا وزن آپ سے پوچھتا ہوں، جس طرح حکم ہو، اُس طرح پڑھوں، جانتا ہوں کہ کاپی نگار کی شامت آئے گی اور غلطی اس سے منسوب ہو جائے گی۔ لیکن مجھے مدرس صاحب سے استفادہ منظور ہے، مصرع یہ ہے اور مدرس صاحب اس کو اوستاد فرخی کا بتاتے ہیں۔" چشمِ مخالفاں بپاژن تیغ تیز (طبع ۲ مرتبہ راقم ص۲۷۴)

آغا نے شمشیر تیز تر میں مصرع زیر بحث کی موزونی ثابت کی ہے اور میں نے ایک مضمون میں جو ڈھاکہ کے ایک ماہنامے نے شائع کیا تھا دکھایا تھا کہ اس کا وزن آج کل نامانوس سہی، لیکن کتبِ عروض میں بکثرت اشعار ایسے ہیں، جو عروضیوں کے نزدیک قطعاً صحیح ہیں، لیکن ہمارے کانوں کو ناخوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین ایک مشہور نقاد و محقق کے متعلق فرماتے تھے کہ ایک صحبت میں شعر پڑھے جا رہے تھے، اور وہ شعر کی تکرار کرتے تھے؛ لیکن موزوں کو ناموزوں کر دیا کرتے تھے۔ یاس ٹونکی مرحوم کی نوبت آئی تو انھوں نے ان سے کہا کہ آپ مجھ پر کرم فرمائیں اور میرے اشعار کی تکرار نہ کریں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان اس زمانے میں کم سن تھے لیکن

مجھ سے کہتے تھے کہ میں بھی اس صحبت میں موجود تھا۔ ان بزرگ کی مرتبہ کتابوں میں ناموزوں اشعار بہت کثرت کے ساتھ ہیں۔ اور ان کے متعلق مطلقاً (مستثنیات سے قطع نظر) یہ صراحت نہیں کہ یہ غلط ہیں۔ تحریر کے شمارہ اول میں متعدد اشعار ناموزوں ہیں اور اُن کے غلط ہونے کی طرف اشارہ نہیں۔

ناموزوں شعر نقل ہو تو یہ صراحت ضرور کر دی جائے کہ اس میں سقم ہے، ورنہ پڑھنے والا اگر یہ سمجھے کہ ناقل کے نزدیک شعر میں کوئی عیب نہیں، تو یہ اس کا قصور ہو گا۔ وہ اصحاب جو موزوں اور ناموزوں میں تمیز نہیں کر سکتے، دواوین وغیرہ کی ترتیب وغیرہ کا کام اپنے ذمے نہ لیں، دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں، ایک نہ ہو سکا تو کیا ہوا۔

فنونِ ادبیہ کی اصطلاحات سے واقفیت

محقق کے لیے فنونِ ادبیہ کی اصطلاحات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ غالب عمر بھر یہ سمجھتے رہے کہ تقریظ، خاتمہ کتاب کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ خود مصنف ہی کے قلم سے کیوں نہ ہو۔ چناں چہ قاطع برہان طبع اول کے خاتمے کو جو خود ان کا لکھا ہوا ہے، انھوں نے تقریظ کہا ہے اور باغِ دودر میں بھی اسے اسی نام سے یاد کیا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اپنے کسی خط میں بھی غالب نے تقریظ کو خاتمہ کتاب کہا ہے۔

فن تاریخ گوئی سے واقفیت

محقق کو فن تاریخ گوئی کے قواعد سے واقف ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں امورِ ذیل کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے۔

الف　سنین صرف ہجری، عیسوی اور فصلی نہیں اور بھی ہیں۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ تاریخ گو نے کس سے کام لیا ہے۔

ب　حروفِ ابجد کے اعداد مشہور (الف:۱، ب:۲ تا غ ۱۰۰۰) کے علاوہ اور اعداد بھی ہیں، مثلاً ایک قاعدے کے مطابق ہر حرف کا عدد وہ ہے جو ان حروف کے اعداد کا مجموعہ ہے جن سے وہ بنتا ہے، اس طرح الف انہیں:۱۳۱ ہے۔

ج　معمولی قاعدے کے متعلق بھی اختلافات ہیں، مثلاً یہ کہ عربی "تا" کے کس صورت میں ۴۰۰ لیے جائیں گے اور کس صورت میں اسے ۵ سمجھ کر صرف ۵) ہمزہ کے متعلق بعض اصحاب کو غلط فہمی ہوئی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ انشا وغیرہ عربی الفاظ کے آخر میں جو ہمزہ ہے، اس کا عدد ایک ہے، اور اس کی بنا پر

ایک کتاب میں جو انشا اللہ خاں انشا سے متعلق ہے، مجھ پر اعتراض بھی ہوا ہے۔ یہ ہمزہ بالکل حساب میں نہیں آتا۔

د　تاریخ گو کن قواعد و املا کا پابند ہے، اس کا خیال ضروری ہے، حافظ نے مادہ تاریخ میں "امید" کو "امیذ" ذال معجمہ کے ساتھ پرانے قاعدے کے مطابق لکھ کر اسے ۷۵۱ قرار دیا ہے۔ بعض ایرانی کتابوں میں "اومیذ" بھی ہے۔ یہ لفظ تاریخ گو نے واؤ کے ساتھ لکھا ہے۔ تو ۷۵۱ میں ۶ کا اضافہ ہو جائے گا۔ اردو کا قدیم املا یہ چاہتا ہے کہ ہندوستانی الفاظ، اِس، اُن وغیرہ میں اظہار ضمہ کے لیے الف کے بعد واؤ آئے۔ اگر کسی پرانے تاریخ گو کا مادہ تاریخ جس میں اس طرح کا کوئی لفظ ہے، جدید املا کے مطابق بدونِ واو نقل ہوا ہے، تو ۶ کا فرق ہو جائے گا۔

ہ　تاریخ گو تعمیہ داخلی و خارجی سے اکثر کام لیتے ہیں، بعض اوقات ہنر نمائی کے لیے عجیب عجیب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ سودا نے حافظ الملک رحمت خان کے جنگ میں مقتول ہونے کی تاریخ یوں کہی ہے:
حافظ نے سر دیا نہ دیا زر" اسباب جنگ میں دشمن کی طرف سے مطالبۂ زر بھی تھا اور یہ بھی کہ واقعہ ۱۱۸۸ھ کا ہے، ورنہ بہت کم لوگوں کا ذہن عدد مطلوب کی طرف جا سکتا۔ حافظ: ۹۸۹ ہے، اس پر زر کا عدد ۲۰۷ بڑھایا جائے تو ۱۱۹۶ ہو جاتا ہے۔ اس میں سے سر حافظ یعنی ح کا ۸ نکالا جائے تو ۱۱۸۸ بچ جاتا ہے۔

و　بعض تاریخ گو عدد مطلوب، صرف بعض الفاظ سے نکالتے ہیں، لیکن ظاہر میں ایسا ہوتا ہے کہ پورا مصرع مادہ تاریخ ہے۔ یہ عیب ہے بعض اصحاب کا خیال ہے کہ ایک کا فرق ہو تو مضایقہ نہیں تعمیہ ممکن ہے تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ذ　مادۂ تاریخ کے ساتھ سنہ مطلوب درج ہو بھی تو اس پر اعتبار کرنا ٹھیک نہیں، بطور خود حساب کرنا چاہیے کہ مادے سے عدد مطلوب نکلتا بھی ہے یا نہیں۔ (اصولِ تحقیق)

قاضی صاحب نے ٹھوس ادبی موضوعات پر تحقیق کی راہ دکھائی۔ تحقیق کے لیے ضابطے اور اصول کی پابندی کو لازم قرار دیا۔ اردو تحقیق کو جدید مغربی تصورات سے روشناس کرایا۔ تحقیق میں مآخذ کی اہمیت، تلاش، استفادے اور اخذِ نتائج کا شعور بخشا۔ متن اور معلومات کی صحت پر شک سے تحقیق کا آغاز کرنے کا تصور اجاگر کیا۔ معروضی انداز میں معلومات کو پرکھنے کی ترغیب دی۔ تحقیق کی زبان کو تخلیق کی زبان سے ممیز کیا۔ ادب

اور ادبی تحقیق سے مزاولت اور غیر معمولی محنت کا اعلیٰ نمونہ پیش کر کے رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ کلیم الدین احمد اُن کے طریقِ تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں قاضی صاحب کا احترام کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان کی وسعتِ نظر کا قائل ہوں۔ اُن کا حافظہ غضب کا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے پیش نظر تحقیق کا ایک بلند آئیڈیل ہے جسے وہ ہمیشہ بلند رکھتے ہیں۔ مجھ سے لوگ کہا کرتے تھے کہ قاضی صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ بھلا اس میں کیا رکھا ہے کہ فلاں شاعر پانچ بج کر دس منٹ پر مرا یا پانچ بج کر بیس منٹ پر اور اس میں کیا رکھا ہے کہ فلاں شاعر کے دیوان کے فلاں نسخے میں کسی لفظ کے نون میں نقطہ ہے اور دوسرے نسخے کے نون میں نقطہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بات صرف اسی قدر ہے تو یہ اہم نہیں لیکن بات یہ ہے کہ تحقیق میں کوئی چیز چھوٹی نہیں ہوتی۔ اور پھر نقطہ نظر کا سوال ہے۔ اگر تحقیق میں طبیعت کاہلی کی خوگر ہو گئی، اگر ذہن نے زمام کو ڈھیل دی، اگر تعیین کی اہمیت جاتی رہی بڑی بڑی باتوں میں بھی یہی کاہلی ہو گی، یہی ڈھیلا پن ہو گا اور اُن کی اہمیت کا صحیح احساس نہیں ہو گا۔ اس لیے تحقیق میں ضرورت ہے exactness کی وہ بڑی چیز ہو یا چھوٹی چیز میں ہو۔ اگر یہ چیز ہاتھ سے جاتی رہی تو پھر تحقیق ممکن نہیں۔ قاضی صاحب کا نقطہ نظر سائنٹفک ہے۔ وہ پوری جانکاری بہم پہچانا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی ہو، ارادی یا غیر ارادی طور پر اس میں کچھ فرق آجائے۔''(۱۲)

حوالہ جات

۱　قاضی عبدالودود: اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں: ڈاکٹر عابد رضا بیدار (مرتب): خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۹۵ء: ص ۵

۲　ایضاً: ص ۳۶

۳　کلیم الدین احمد (مدیر): معاصر قاضی عبدالودود نمبر: دائرہ ادب، سنگی مسجد، پٹنہ ۶: اگست ۱۹۷۶ء: ص ۳

۴　قاضی عبدالودود سیمینار کے مقالے: مشتاق احمد نوری (مرتب): بہار اردو اکیڈمی بہار: ۱۹۹۶ء: ص ۶۶، ۶۵۔

۵　ایضاً: ص، ۲۲۷

۶　ایضاً: ص، ۳۴۸

۷　قاضی عبدالودود (مدیر): قاضی عبدالودود کا ۱۹۳۶ء کا معیار: ڈاکٹر عابد رضا بیدار (مرتب): خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۸۱ ص ۳

۸　اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں: ص، ۲۲

۹　ایضاً: ص ۳۳

۱۰　معاصر قاضی عبدالودود نمبر: ص ۱۲۶۔۱۲۷

۱۱　ڈاکٹر عابد رضا بیدار (مرتب): تدوینِ متن کے مسائل (خدا بخش لائبریری سیمینار): خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۸۲ء: ص ۴

۱۲　معاصر قاضی عبدالودود نمبر: ص ۴۲۵، ۴۲۴